ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور تخلیق (۴)

اِنسان کی آرزوئے حسُن

حق کی محبّت انسان کے اندر نمودار کر دی گئی ہے تاکہ انسان بھی خدا کے نصب العین کی تکمیل کے لیے اِس کا شریک کار بن جائے اس نصب العین کی تکمیل انسان کی اپنی ہی تکمیل ہے اس طرح خدا اور انسان کا نصب العین بالآخر ایک ہی ہے گویا اگر انسان حق کا اتباع کرے تو کسی پر احسان نہیں کرے گا بلکہ اس میں اس کا اپنا ہی فائدہ ہوگا اور اس سے اُسے اپنی ہی فطری محبّت کی تشفی حاصل ہوگی۔

یَاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدٰى
فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ۔ (یونس: ۱۰۸)

اے لوگو تمہارے پاس وہ تعلیم جو (حق کا عمل اور اظہار ہے اور لہٰذا) حق ہے پہنچ گئی ہے۔ جو شخص اس سے مستفید ہو کر راستہ پائے گا اس کی ہدایت اپنی ہی جان کے لیے ہوگی۔

تخلیق کی اوّلین صورت

جب خداوند تعالیٰ نے اپنے تصورِ حُسن یعنی انسانیت کاملہ کے تصوّر کو قولِ کُن کہا تو خارج میں انسانیتِ کاملہ کی اوّلین صُورت جو وجُود میں آئی وہ ایک قسم کے نُور کی شکل میں تھی جو ایک خاص قسم کی برقی لہروں پر مشتمل تھی جنہیں اب سائنس دان کاسمک شعاعوں یا کائناتی شعاعوں کا نام دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نور ہے۔ نورؔ خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے اور نور سے جو چیز سرزد ہو وہ نور ہی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے نور میں اور اس نور میں فرق یہ ہے کہ خدا کا نور روحانی اور غیر مادّی اور غیر مخلوق اور بے مثل ہے۔ وہ زندہ ہے بلکہ خود زندگی یا خودی یا حیات یا رُوح ہے اور اسے

ہم ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے جبکہ یہ نورِ مادی اور مخلوق ہے اور اس کا خالق اس کی مماثل صفات رکھنے والا کوئی اور نور بھی پیدا کر سکتا ہے۔

چونکہ نور سب سے پہلی مادی چیز ہے جو خدا نے پیدا کی لہٰذا نور مادی اشیاء میں سب سے زیادہ خدا کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان اشیاء میں سب سے زیادہ لطیف ہے یہاں تک کہ کوئی مادّی چیز نہیں جو اپنی حرکت میں نور سے بڑھ کر رفتار حاصل کر سکے۔ اقبالؔ لکھتے ہیں:

"جدید طبعیات کی تعلیم یہ ہے کہ نور کی رفتار سے زیادہ رفتار کسی چیز کی نہیں ہو سکتی اور یہ رفتار تمام مشاہدہ کرنے والوں کے لیے یکساں رہتی ہے اس بات سے قطع نظر کہ ان کی اپنی حرکت کس نظام سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نور مادّی تغیّرات کی اس دنیا میں ہستیٔ مطلق سے قریب ترین چیز ہے۔"

پھر جوں جوں یہ ابتدائی نور مادی طور پر پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہوتا گیا وہ اپنے مصدرِ حقیقی سے دور ہوتا گیا اور اس میں کثافت آتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مٹی بن گیا اور مٹی کی حالت میں آ کر وہ زندگی یا رُوح جو اس کے اندر مخفی تھی آشکار ہونے لگی لہٰذا وہ حیوان کی صورت میں آیا اور پھر اپنی حیوانی ترقی کی انتہا پر انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ انسان کے نیچے کے تمام حیوانات (جن میں خودی اتنی آزاد یا ترقی یافتہ نہیں کہ وہ خدا کے زندہ مقدّس فوق الطبعیاتی یا روحانی نور کو سمجھ کر اس کے لیے کشش محسوس کر سکیں اور جن کے شعور میں کائنات کی ہر چیز کی طرح خدا کی محبت چھپی ہوئی ہے) مادی نور کے لیے ایک نہ ایک رنگ میں کشش محسوس کرتے ہیں۔ اگر پروانہ شمع کے نور پر فدا ہے تو چکور چاند کے نور پر جان چھڑکتی ہے۔ پرندے سمندروں میں روشنی کے میناروں کے ارد گرد رات بھر چکر کاٹتے رہتے ہیں۔ زندگی خدا کے نور کو مادی نور سے اس وقت ممیّز کرنے لگتی ہے جب وہ انسان کی صورت میں خود شعور اور خودنگر ہو جاتی ہے۔ اس مادی نور میں جو انسانیتِ کاملہ کی اوّلین صورت تھی خدا کا نور خدا کی محبت کی صورت میں بطور جان کے چھپا ہوا موجود تھا اس لیے خدا نے اپنے آپ کو کائنات کا نور کہا ہے:

اللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور: ۳۵)

اللہ کائنات کا نور ہے

تخلیق اور حرکت

خدا کے قولِ کُن میں خدا کی محبت ہی نہیں بلکہ اس کے ارادۂ تخلیق کی قوت اور اس کے حکم کا زور بلکہ اس کی تمام صفاتِ جمال و جلال پوشیدہ تھیں۔ خدا کے اسی ارادہ یا حکم کے زور کی وجہ سے یہ مادی نور برقی لہروں کی صورت میں اپنے ارتقا کی منزل مقصود یعنی تکمیلِ انسانیت کی منزل کی طرف متحرک ہوا۔ اس مخلوق نور میں حرکت اس لیے تھی کہ وہ خدا کے ارادۂ تخلیق کا مظہر تھا اور خدا کے ارادۂ تخلیق کا مقصد یہ تھا کہ تخلیق کی ابتدائی حالت کو حرکت دے کر اس کی انتہائی حالت یا حالت کمال تک جو اس ارادہ نے اس کے لیے معین کر رکھی تھی پہنچائے۔ لہٰذا حرکت شروع ہی سے عمل تخلیق کی ضروری علامت کے طور پر رونما ہوئی۔ طبعیات کا ایک مُسلّم اصُول ہے کہ حرکت بغیر قوت کے نہیں ہوتی۔ اس ابتدائی مادی نُور کی حرکت کا باعث خدا کے قول کُن کی بے پناہ قوت تھی جو مادی نہیں بلکہ ارادی قوت تھی۔ اب بھی یہی قوت اپنی مختلف حالتوں سے گزرتی ہوئی کائنات کی تخلیق اور نشو و ارتقا کے لیے کار پرداز ہے۔ چونکہ یہ قوت خدا کی تمام صفات جمال وجلال کی حامل ہے اور خدا کی تمام صفات اس کے اندر کارفرما ہیں لہٰذا یہ قوت زندگی اور خودی سے الگ ہونے کے باوجود خود زندگی اور خودی ہے۔ اگر اس قوت کی صفاتِ جمال براہِ راست اور بلاواسطہ تخلیق و ارتقا کے مقاصد کے لیے کام کرتی ہیں تو اس کی صفاتِ جلال تخلیق و ارتقا کی رکاوٹوں کو دُور کر کے بالواسطہ ان ہی مقاصد کی پیش برو کے لیے کام کرتی ہیں۔

اِنسانی خُودی سے مُراد

جب اقبال کہتا ہے کہ خودی انسان میں رُونما ہوئی ہے تو وہ خودی اسی قولِ کُن کی قوت کو کہتا ہے جو خودی یا زندگی کی تمام صفاتِ جمال وجلال کی حامل ہے۔

یہی قوت روحِ انسانی ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ وہ خدا کا امر یا حکم ہے اقبال کے اس خیال کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے کہ اقبال حلول کا قائل ہے۔ لیکن دراصل جس طرح سے ایک مصور کی خودی یا شخصیت تصویر میں حلول نہیں کرتی اور اپنی تمام صفاتِ کمال

کے ساتھ تصور میں جلوہ گر ہونے کے باوجود اس سے الگ تھلگ رہتی ہے اس طرح سے خدا کی ذات یا خودی اس کی مخلوق کائنات میں حلول نہیں کرتی بلکہ اپنی تمام صفات کمال کے ساتھ مادی حیوانی اور انسانی کائنات میں جلوہ ریز ہونے کے باوجود اس سے جُدا رہتی ہے۔

تخلیقِ کائنات کے مراحل

یہاں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کس طرح سے قولِ کن کی تخلیقی قوت نے برقی لہروں کی حرکت سے کام لیا اور اُن کو گرہوں کی شکل دے کر ایسی برقی اکائیاں بنا دیں۔ جو یا تو بے بار تھیں یا مثبت اور منفی باروں (CHARGES) کی حامل تھیں اور جن کو ہم نیوتران، پروتان اور الکٹران کہتے ہیں اور پھر کس طرح سے ان برقی اکائیوں کی باہمی کشش سے کام لے کر اس قوت نے ان کو ایک دُوسرے کے ساتھ ملا کر جواہر (ATOMS) کی شکل دے دی اور پھر کس طرح سے اس نے جواہر کی باہمی کشش کے ذریعہ سے ان کو عناصر کے سالمات (MOLECULES) کی شکل میں جوڑ دیا اور پھر کس طرح سے مادہ کے دھوئیں یا گیس کا ایک بہت بڑا بادل وجود میں آیا جو اور چھوٹے چھوٹے بادلوں میں بٹ گیا اور پھر کس طرح سے ان بادلوں سے ستاروں کے جمگھٹے بن گئے اور سیاروں کے نظام وجُود میں آئے جن میں سے ہمارا نظامِ شمسی ایک ہے۔

طبعیات کی کتابوں میں اس مادی ارتقاء کی تفصیلات موجُود ہیں اگرچہ زمانۂ حال کی لادینی طبعیات کے حکماء اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اصل قوت جو مادی ارتقاء کے پیچھے کام کر رہی تھی وہ خدا کے ارادہ تخلیق یا قولِ کُن کی قوت تھی۔ حاصل یہ ہے کہ خدا کے قولِ کن یا ارادہ تخلیق کی بے پناہ قوت مادی نور کو ربوبیت یا ارتقاء کی منزلوں کی طرف برابر آگے دھکیلتی رہی اور وہ برابر ارتقاء کرتا رہا اور اس کا مادی ارتقاء ہمارے کُرّہ ارض پر اس وقت مکمل ہوا جب مادّہ اس قابل ہو گیا کہ زندگی کو جنم دے سکے اور جب وہ اس قابل ہوا تو پہلا حیوان جو وجُود میں آیا وہ ایک خلیہ کا حیوان تھا جسے امیبا (AMOEBA) کہتے ہیں جس طرح سے کائناتی نورُ انسان کی اوّلین مادّی صورت تھی، امیبا انسان کی اوّلین حیوانی شکل تھی۔ پھر امیبا خدا کے قولِ کن یا ارادۂ تخلیق کی قوت سے برابر ارتقاء کرتا رہا۔ یہاں تک کہ مکمل جسم انسانی نمودار ہوا۔ جسمِ انسانی کے ظہور پذیر ہونے کے بعد انسان کی ساری ترقی اس کی نفسیاتی یا نظریاتی

ترقی ہے جو اس کے رُوحانی اور نظریاتی کمال کا باعث ہو گی۔

خُدا کے حُسن کی کشش ہر چیز میں ہے

چونکہ خدا کے قولِ کُن کی اصل خدا کی محبت ہے جو کشش اور جذب ہی کا دوسرا نام ہے لہٰذا ربوبیت کے کام کو جاری رکھنے کے لیے خدا کے قولِ کُن یا ارادۂ تخلیق کی قوت نے ہمیشہ کشش یا جذب کی صُورت میں اپنا اظہار کیا ہے۔ طبعیاتی مرحلۂ ارتقا میں اس کشش نے برقی قوت کے مثبت اور منفی باروں کی باہمی کشش اور تمام مادی قوانین کی شکل اختیار کی۔ حیاتیاتی مرحلۂ ارتقا میں ممدِ حیات اعمال و افعال کی کشش اور تمام حیاتیاتی قوانین کی صورت میں اپنا اظہار کیا اور انسانی مرحلۂ ارتقا میں نصب العین کی محبت کی صُورت میں ظاہر ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے جابجا اس کا ذکر کیا ہے کہ آرزوئے حُسن یا عشق ایک جذب یا کشش کی صورت میں دنیا کی ہر چیز کے اندر موجود ہے۔ عشق ہی کی قوت سے مادی، حیاتیاتی اور انسانی سطحِ ارتقاء پر کائنات کے تمام تخلیقی اور ارتقائی اعمال جاری ہوتے ہیں۔ یہ خدا ہی کی محبت یا آرزوئے حُسن ہے یعنی خدا کی وہی آرزوئے حُسن جس کا مقصود خدا کا اپنا نصب العین ہے جو انسان میں نمودار ہوئی ہے اور نمودار ہو کر منتہائے حُسن یعنی خدا کی طلبگار ہوئی ہے۔ اسی طلبِ حسن کے ذریعہ سے انسان اپنے حسن کے کمال کو پہنچے گا اور وہ نصبُ العینی انسان بنے گا جسے خدا پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر خدا کی یہ محبت جس کا حامل خدا کا قولِ کُن ہے کائنات کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہر چیز کے باطن میں نہاں ہو کر آگے نہ جاتی تو انسان میں کیسے نمودار ہو سکتی تھی۔

خاص انسان سے کچھ حُسن کا احساس نہیں
صورتِ دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں
شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
رُوحِ خورشید ہے، خونِ رگِ مہتاب ہے عشق
دلِ ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نُور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسرّت، کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے، کہیں اشک، کہیں شبنم ہے

سورج اور چاند کی گردش جس کا بنیادی سبب برق کے مثبت اور منفی باروں کی باہمی کشش ہے لا الٰہ یعنی خدا کی محبت کے اس سوز ہی سے ممکن ہوئی ہے جو بعد میں انسان کے اندر نمودار ہوا ہے، بلکہ یہ سوز پہاڑوں میں اور گھاس کے تنکوں میں اور ہر چیز میں موجود ہے۔

مہر و مہ گردد ز سوزِ لا الٰہ
دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کاہ

خدا کی محبّت کے اس سوز اور زور سے ہی جو بعد میں انسان کے اندر نمودار ہوا ہے آسمان گردش کرتا ہے اور کائنات کا تمام کاروبار چلتا ہے۔ یہی سوزِ محبّت آفرینشِ کائنات کی غرض و غایت ہے۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ — انتہائے کارِ عالم لا الٰہ
چرخ را از زورِ او گردندگی — مہر را پائندگی رخشندگی،
بحر گوہر آفرید از تابِ او — موج در دریا تپید از تابِ او
خاک از موجِ نسیمش گل شود — مُشتِ پر از سوزِ اُو بلبل شود
شُعلہ در رگہائے تاک از سوزِ او — خاکِ مینا تابناک از سوزِ او
نغمہ ہایش خفتہ در سازِ وجود — جویدت اے زخمہ ور سازِ وجود

قرآن حکیم میں ہے کہ دُنیا کی ہر چیز خدا کے حسن کی ستائش کرتی ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ (الاسراء: ۴۴)

اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکیزگی کی ستائش نہ کرتی ہو

اس آیت میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہر چیز میں خدا کی محبت ہے۔

خُدا اپنے محبُوب کی جستجو میں ہے

کائنات کی ہر چیز بتا رہی ہے کہ خدا کا ایک محبُوب ہے جو اس سے بچھڑا ہوا ہے اور جسے وہ

اپنی مسلسل تخلیقی فعلیت کے ذریعہ سے تلاش کر رہا ہے۔ خدا کی محبّت کبھی لالہ کی خوبصورت پتیوں پر اپنا پیغام لکھتی ہے کبھی پرندوں کے سینوں سے نکلنے والی دردناک ہاؤہو میں ظاہر ہوتی ہے کبھی نرگس کے پھول میں آنکلتی ہے، گویا کہ چاہتی ہے کہ نرگس کی آنکھ سے اپنے محبوب یعنی مستقبل کی کامل نوعِ بشر کا مشاہدہ کرے۔ اور حسینوں کے کرشمے کیا ہیں، گویا خدا ان کی حسین آنکھوں سے اپنی محبت کا پیغام سُنا رہا ہے۔ زمان ومکان کیا ہیں، گویا ہمارے فراق میں خدا کی ایک محبت بھری آہ ہے جس نے زمان ومکان کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایک حسین و جمیل پیکرِ خاکی کے حُسن کا دیدار کرنے کے لیے خدا نے پُوری کائنات کا ہنگامہ برپا کیا ہے۔ یہ تماشائے رنگ وبُو محبوب کے نظارہ کے لیے ایک بہانہ ہے۔ خدا اپنی محبّت کی وجہ سے کائنات کے ذرّہ ذرّہ میں پوشیدہ ہے اور لہٰذا ہم سے نا آشنا ہے۔ اس کے باوجود وہ ماہتاب کی طرح آشکار ہے اور اُسی کی طرح کاخ وکو کی آغوش میں چمک رہا ہے۔ غرض زندگی کا ایک گوہرِ تابدار ہماری اس خاکی کائنات میں گم ہے۔ کیا وہ خدا ہے جسے ہم تلاش کر رہے ہیں یا ہم ہیں جنہیں خدا تلاش کر رہا ہے، بات ایک ہی ہے۔ یہ گوہرِ تابدار ہم ہوں یا خدا جب ایک ملے گا تو دُوسرا بھی ساتھ ہی مل جائے گا۔

ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجوست — چوں ما نیاز مند و گرفتارِ آرزوست
گاہے بہ برگِ لالہ نویسد پیامِ خویش — گاہے درُونِ سینۂ مرغاں بہ ہاؤ ہوست
در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما — چنداں کرشمہ داں کہ نگاہش بہ گفتگوست
آہے سحر گہی کہ زند در فراقِ ما — بیرون و اندرون زبر و زیر و چار سوست
ہنگامہ بست از پئے دیدارِ خاکئے — نظّارہ را بہانہ تماشائے رنگ و بوست
پنہاں بہ ذرّہ ذرّہ و ناآشنا ہنوز — پیدا چو ماہتاب بہ آغوشِ کاخ و کوست
در خاکدانِ ما گہرِ زندگی گم است — ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

کروڑوں برس کا عمل ارتقا خدا کے ایک لمحہ میں سما جاتا ہے

ارتقاء کا یہ عمل ہمارے پیمانۂ وقت کے مطابق کروڑوں برس کی مدت میں پھیلا ہوا ہے لیکن

خدا کے نزدیک ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کا زمانہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آنکھ کا جھپکنا۔ گویا ادھر خدا نے قولِ کن کہا اور ادھر کائنات کی وہ حالتِ کمال وجود میں آگئی جس کے بعد قیامت کا زمانہ آنا مقدر ہے۔

وَمَآ اَمۡرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمۡحِ الۡبَصَرِ اَوۡ هُوَ اَقۡرَبُ۔ (النحل: ۷۷)

اور قیامت کا آنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آنکھ کا جھپکنا بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ قریب ہے۔

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ○ (یٰسین: ۸۲)

اس کے حکم کی یہ کیفیت ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر ہم وقت کے اپنے پیمانہ کے مطابق کائنات کی تخلیق کے عمل کا جائزہ لے رہے ہوں اور اس کی تفصیلات اور جزئیات کا مطالعہ کر رہے ہوں جیسا کہ ہم کرنے پر مجبور ہیں تو ہمیں نظر آئیگا کہ آنکھ جھپکنے کی یہ مدت اس قدر طویل ہے کہ کروڑ ہا برس کا عمل ربوبیت یا عمل ارتقا جس کا ایک حصہ گزر چکا ہے اور ایک ابھی باقی ہے اس کے اندر سمایا ہوا ہے اور جب سے نسلِ انسانی پیدا ہوئی ہے نسلاً بعد نسلٍ اس عملِ ربوبیت کا مشاہدہ کرتی جا رہی ہے آئن سٹائن کے نظریہ نے اب اس حقیقت کو ریاضیاتی طور پر منکشف کیا ہے کہ وقت ایک اضافی چیز ہے۔ شعور کی ہر سطح کے لیے وقت کا پیمانہ الگ ہوتا ہے۔ ہمارے بعض خوابوں سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ ہماری بیداری کی حالت کا ایک لمحہ ہماری نیند کی حالت کے کئی گھنٹوں بلکہ دنوں کے برابر ہوتا ہے۔

اسی طرح سو سال کا عرصہ موت کی حالت میں صرف ایک دن یا ایک دن کے حصہ کے برابر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے:۔

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ قَالَ كَمۡ لَبِثۡتَ

قَالَ لَبِثۡتُ يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ (البقرة: ۲۵۹)

اور خدا نے اسے ایک سو سال تک حالتِ موت میں رکھا اور پھر اسے زندہ کیا۔ اللہ نے پوچھا تم کتنا عرصہ حالت موت میں رہے ہو تو اس نے جواب دیا ایک دن یا اس کا کچھ حصہ۔

پھر قرآن میں ہے کہ خدا کا ایک دن ہماری گنتی کے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُہٗٓ اَلْفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ (السجدۃ : ۵)

ایک ایسے دن میں جس کی طوالت تمہارے حسابات کے مطابق ایک ہزار سال کے برابر ہوتی ہے۔

اقبال لکھتے ہیں :

"اگر ہم اس حرکت کا جس کا نام تخلیق ہے خارج سے مشاہدہ کریں۔ دوسرے الفاظ میں اگر ہم اسے ذہنی طور پر سمجھیں تو یہ ایک ایسا عمل ہے جو ہزاروں سال کی مدت میں پھیلا ہوا ہے کیونکہ قرآن کی مصطلحات کے مطابق اور تورات کی مصطلحات کے مطابق بھی خدا کا ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ لیکن ایک اور نقطۂ نظر سے یہ ہزاروں سال کا عمل تخلیق ایک واحد ناقابلِ تقسیم فعل ہے جو ایسا سریع الحرکت ہے جیسے کہ آنکھ کا جھپکنا۔"

قولِ کُن کی ممکنات

تخلیق ایک آزادانہ فعل ہے تاہم اپنے مقاصد کا پابند ہے۔ تخلیق کا ارادہ ایک آزادانہ جمالیاتی وجدان (AESTHETIC JUDGEMENT) کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن اس ارادہ کی ممکنات اس کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ ارادہ کی ممکنات کا پہلے سے موجود ہونا ارادہ کی آزادی میں فرق پیدا نہیں کرتا۔ خدا کے قولِ کُن کے اندر خدا کی تمام صفات اور ربوبیت کی تمام قدرتیں اور قوتیں اور تخلیق کی تمام ممکنات جمع تھیں۔ اس لیے تمام تخلیق قولِ کُن کی ممکنات کا ظہور ہے جو قولِ کُن کے اندر مخفی قوتوں کے عمل سے ممکن ہوا ہے۔ تمام مادی قوانین یعنی مادی اشیاء کی تمام کیفیات اور خاصیات خدا کے قولِ کُن کی ممکنات تھیں جو ظہور پذیر ہو گئی ہیں۔ اگر ان قوانین کی تخلیق کے پیچھے خدا کا ارادۂ تخلیق یا خدا کا جذبۂ محبت یا خدا کی ربوبیت کی قوت کام نہ کرتی تو یہ کبھی وجود میں نہ آ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ ارتقاء کا عمل ایسا ہے جیسے کہ ایک بیج کا اپنی ممکنات کو ظہور پذیر کرنا اور اسی اظہار سے بالآخر ایک مکمل درخت بن جانا۔ مکمل درخت بیج کے اندر بالقوہ موجود ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ باہر آتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارتقاء کے ہر مرحلہ پر خواہ وہ مادی ہو یا حیاتیاتی یا نفسیاتی، زندگی کو جو قوتیں بھی کسی وقت حاصل ہو جاتی ہیں ان ہی قوتوں اور صلاحیتوں کے

عمل سے نئی قوتیں اور صلاحیتیں جنم لیتی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ نئی قوتیں اور صلاحیتیں پُرانی قوتوں اور صلاحیتوں کے اندر بالقوہ موجود تھیں۔ مثلاً اگر برقی کائناتی شعاعوں کے اندر جذب اور دفع کے عمل کی وجہ سے حرکت نہ ہوتی تو ان سے الکٹران اور پروتان کی برقی گٹھڑیاں پیدا نہ ہو سکتیں اور اگر ان گٹھڑیوں کے اندر باہمی کشش نہ ہوتی تو ان سے مل کر جواہر یا ایٹم تیار نہ ہوتے۔ اور ایک ہی قسم کے جواہر کے اندر باہمی کشش نہ ہوتی تو ان سے سالمات تیار نہ ہو سکتے اور اگر سالمات کے اندر باہمی کشش نہ ہوتی تو ان سے ایک بڑا نبولا تیار نہ ہوتا اور اس کے اندر محوری حرکت پیدا نہ ہو سکتی اور اس حرکت کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے نبولے نہ بنتے اور ہمارا نظامِ شمسی اور ہماری زمین وجود میں نہ آ سکتے۔ اسی طرح سے حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں ہر حیوان اپنی قوتوں کے عمل سے اور قوتیں پیدا کرتا ہے اور پھر ان نئی قوتوں کے عمل سے اور نئی قوتیں پیدا کرتا ہے یہاں تک کہ انسان ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ تاہم تخلیق کا عمل اپنے کسی مرحلہ میں بھی خداوندی قولِ کُن کے حکم اور زور کے بغیر ایک قدم کے بعد دوسرا قدم نہیں اُٹھا سکتا اور تخلیق کی کسی حالت کو بھی اگلی حالت میں نہیں بدل سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیق میکانکی اور مادی نہیں بلکہ ارادی اور رُوحانی ہے اور اپنے ہر قدم پر خدا کے حکم اور آزادانہ ارادۂ تخلیق کا نتیجہ ہے۔ جسے ہم سلسلۂ اسباب کہتے ہیں وہ درحقیقت قولِ کُن کی ممکنات کا سلسلہ ہے اور خالق کے نصب العین کے ماتحت اور خالق کی آزادانہ تخلیق سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

ارتقاء کے لیے حیوان کی جدّوجہد

حیوان کی وہ قوتیں جن کو ہم جبلّتوں کا نام دیتے ہیں جذب اور دفع کی صورت میں ہوتی ہیں اور ان قوّتوں کا عمل حیوان کی جدّوجہد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس جدّوجہد کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ حیوان ان چیزوں کو قریب لائے اور حاصل کرے جو اس کی بقا اور نشوونما کے لیے ممدّ و معاون ہوں اور ان چیزوں سے گریز کرے یا راستے سے ہٹائے جو اس کی بقا اور نشوونما کے لیے مضر اور مخالف ہوں۔ حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب حیوانات اپنے اُن مقاصد کے حصول کے لیے جو ان جبلّتوں سے پیدا ہوتے تھے کوشش کرتے تھے تو ان کی جدّوجہد خودی کائنات کے ارادہ کی قوّت کا آلۂ کار بن کر اسے زیادہ سے زیادہ کارفرما ہونے کا موقع دیتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان حیوانات کے اندر ایسی نئی قوتیں اور جسمانی کیفیتیں رونما ہو جاتی تھیں جو ان کے مقاصد کے حصول

کے لیے ضروری ہوتی تھیں اور اس طرح سے ان کی جدّوجہد زندگی کی مخفی صلاحیتوں کو کسی قدر اور آشکار کر دیتی تھی اور حیوانات کو ارتقاء کی آخری منزل یعنی مکمل جسم انسانی سے اس کی تمام معروف قوتوں اور صلاحیتوں کے سمیت قریب تر لے آتی تھی۔ اسی جدّوجہد اور کوشش کا نتیجہ ہے کہ پرندوں نے پر پیدا کر لیے اور اُڑنا یا چلنا یا چہچہانا سیکھ گئے اور ہم نے بھی آنکھ، کان، ہاتھ، دانت اور دماغ ایسے پیچیدہ اعضا، یا فکر، تخیّل، یاد اور ہوش ایسے مفید قوے پیدا کر لیے۔ دیکھنے کی خواہش نے جو جدّوجہد ہم سے کرائی وہی ہماری آنکھ بن گئی۔ اگر کبک میں شوخئ رفتار کی تمنا نہ ہوتی تو اسے پاؤں میسّر نہ آتے بلبل گانے کی آرزو نہ کرتا تو منقار نہ پا سکتا۔ ہمارے تمام قوے ہماری خواہش اور خواہش کے مطابق جدّوجہد کے نتیجہ کے طور پر ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

چیست اصلِ دیدہ بیدارِ ما؟ | بست صورت لذّتِ دیدارِ ما
کبک پا از شوخئ رفتار یافت | بُلبل از سعئ نوا منقار یافت
زندگی مرکب چو در جنگاہ باخت | بہرِ حفظِ خویش ایں آلات ساخت

جذب اور دفع کے مظاہر کا سبب

چونکہ عملِ ارتقاء کی قوتِ محرکہ وہی محبّت ہے جو روزِ ازل سے خدا کے ارادۂ تخلیق یا خدا کے قولِ کُن میں مضمر تھی۔ لہٰذا اس قوت کا ایک پہلو محبت ہے اور دوسرا بیزاری۔ کیونکہ خدا کو ہر وہ چیز پسند ہے جو اس کے عملِ تخلیق کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے، اور ہر وہ چیز ناپسند ہے جو اس کے عملِ تخلیق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن میں جا بجا اس کا ذکر ہے کہ کون سے انسانی اعمال خدا کو پسند نہیں اور کون سے پسند ہیں۔ خدا کے قولِ کن کی قوت کے یہ دونوں پہلو مادّی مرحلۂ ارتقا میں مقناطیسی یا برقی جذب اور دفع کی قوتوں میں اور حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں میلان اور فرار کی جبلتوں میں نمودار ہوئے تھے اور اب انسانی مرحلۂ ارتقاء میں نظریہ کی محبت اور ضدِّ نظریہ کی نفرت کے جذبات کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں۔ انسان ہر اس چیز سے محبّت کرتا ہے اور اس کو قریب لانے یا اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے نصب العین کے لیے ممدّ و معاون ہو اور ہر اس چیز سے نفرت یا گریز کرتا ہے اور اس کو دُور کرنے یا اس سے دُور رہنے کی کوشش کرتا جو اس کے نصب العین کی مخالف ہو۔

کوشش یا جدّوجہد جس طرح سے حیوانی مرحلۂ ارتقاء میں حیاتیاتی ترقی کی کلید تھی، اس طرح سے اب
انسانی مرحلۂ ارتقاء میں نظریاتی یا نفسیاتی ترقی کی کلید ہے۔

بقیہ: حرفِ اوّل

تک مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ حدیث و فقہ کی مبادیات کی بھی اچھی خاصی واقفیت اسے
حاصل ہوگی اور اس سب پر مستزاد یہ کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں دین کا ایک جامع اور
مرکی تصور بھی وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے آجائے گا جو آئندہ عملی زندگی میں اس
کے لیے اہم اثاثہ ثابت ہوگا۔ (ان شاء اللہ) البتہ جو طلبہ قرآن کالج کے علاوہ کسی کالج
سے ایف اے/ایف ایس سی کرنے کے بعد بی اے کرنے کی غرض سے قرآن کالج میں
داخلہ لیں گے، انہیں ایک اضافی سال بہرحال دینا ہوگا کہ کُل دو سال کے عرصے میں بی اے
کی مکمل تیاری کے ساتھ مذکورہ بالا دینی نصاب کی تکمیل کسی طور ممکن نہیں۔

قرآن کالج میں ایف اے کلاسز کے لیے داخلوں کا آغاز میٹرک کا رزلٹ نکلنے
کے بعد اُنہی ایام میں ہوگا جب دیگر کالجوں میں داخلے شروع ہوتے ہیں۔ قارئین کے لیے
متوقع ہے کہ وہ ابھی سے اپنے گھروں اور حلقۂ احباب میں شامل اُن طلبہ کو ہدف بنا کر
محنت کرنا شروع کریں جو اس سال میٹرک کا امتحان دے چکے ہوں اور انہیں ذہناً آمادہ
کریں کہ وہ قرآن کالج میں داخلہ لے کر اُس حدیثِ نبوی کے کسی درجے میں مصداق بننے
کی سعی کریں جس کی رُو سے قرآن کا پڑھنا پڑھانا ہی بہترین کیریئر ہے۔ خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ
الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ۔ تفصیلات کے لیے پراسپکٹس مرکزی انجمن کے دفتر واقع ۳۶ کے
ماڈل ٹاؤن سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

تصحیح

ماہ جون کے حکمت قرآن میں "نقطۂ نظر" کے تحت
شیخ عباس علی صاحب کی تحریر شائع ہوئی ہے، جس میں
اُن کے نام کے ساتھ سہواً "سید" لکھا گیا ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔